سر سید احمد خان کی اصلاحی کوششیں: ایک جائزہ

جانس خان*

خان فقیر**

In this article, Sir Syed Ahmad Khan's reforms and visionary ideals are discussed in detail. He had full comprehension of Muslim rise and fall in India. The fall after 1857 was such that, had Sir Syed not taken a timely action the Muslims of India would have doomed to perpetual slavery for another century.

Sir Syed forewarned Muslims not to fall in the trap of Congress. He forbade them from taking part in politics. He emphasized upon them to acquire modern education, learn science subjects, to understand technology and opt for English language.

The people of Pakistan need personalities like Sir Syed Ahmad Khan, who could harness the youth to modern vistas of knowledge and save the nation from complete destruction. His life is a beacon of light for us, to devote our lives and energies for higher ideals. Pakistani's must heed to his message, so they may fulfil their desire to attain respectable existence among the nations of the world.

برِ صغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی حکومت تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے پر محیط رہی۔ ان حکومتوں میں مختلف اقوام کے لوگ پُر امن زندگی گزار رہے تھے۔ خصوصاً ہندو قوم، نہایت خوش حال تھی۔ اس کے علاوہ دیگر اقوام بھی اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی میں کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرتی تھیں۔ تاہم آخری وقت میں مسلمان حکمرانوں کی یہ حالت تھی کہ انہیں محلات کی نشاط انگیز زندگی سے

---

* انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اینڈ اریبک سٹڈیز، یونیورسٹی آف پشاور، پاکستان۔

** لیکچرر، یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، بنوں، پاکستان۔

فرصت نہ تھی۔ باہر کے ماحول سے انہیں کوئی سروکار نہ رہا۔ حُسن خواہ عمارت میں ہو یا انسانی چہروں پر، اُن کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ اگر چنگ و رباب سے فرصت ملی تو غرقِ مے ناب ہو کر رہ گئے۔ اس بے اعتنائی اور بے فکری کا نتیجہ تھا کہ دلوں کا شاہی سکون باہم رقابت میں جلنے لگا۔ محلات سے جو شعلے اٹھے، انھوں نے نہ صرف مغلیہ سلطنت بلکہ سارے ہندوستان کے امن کو ہمیشہ کے لیے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔'' ۱

جنگِ آزادی کے بعد مسلمان جس طرح تباہ ہوئے اس پر سر سید کا درد مند دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس صورتِ حال کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی صرف مسلمانوں نے شروع کی تھی۔

ہر سیاسی تحریک کے پیچھے دو محرکات کار فرما ہوتے ہیں۔ ایک حالات و واقعات اور دوسرا شخصیات۔ حالات وہی تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد پیدا ہوئے اور شخصیت سر سید احمد خان کی تھی، جس نے حالات کا ڈٹ مقابلہ کیا۔۲

ہندوؤں نے بھی انگریزوں کے دلوں میں مسلمان دشمنی کا بیج بونے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ انگریز کے خیر خواہ اور اس کے مطیع و فرماں بردار رعایا بن گئے اور اس کی خیر خواہی کی آڑ میں مسلمانوں سے ہزار سال کی نام نہاد غلامی کے بدلے نکالنے لگے۔۳ مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالت بہتر کرنے کے لئے سر سید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی، جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

سر سید کے حالاتِ زندگی

سر سید احمد خان ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر متقی تھا۔ اُن کے نانا خواجہ فرید الدین اکبر شاہ ثانی کے وزیر تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب سید احمد خان نے انسانی ہمدردی کے تحت انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کے بیس افراد کی جانوں کی حفاظت کی اور انہیں ہر طرح کی ممکنہ سہولتیں فراہم کیں تو سر سید احمد خان کے اس جذبہ خدمت، بے پناہ انسانی ہمدردی اور غیر تعصبانہ خلوص و انس کے باعث انہیں ''سر'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

۱۸۵۷ء میں سر سید احمد خان کو صدر الصدور یعنی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ ۱۸۷۶ء میں

اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۳ء تک گورنر کی لجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے، اور ایک بھر پور مصلحانہ زندگی گزارنے کے بعد آپ ۱۸۹۸ء میں وفات پا گئے۔[۴]

تعلیمی خدمات

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر سرکاری نوکریوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ سر سید کو اس بات کا بہت قلق تھا کہ مسلمان جو کچھ عرصے پہلے تک ہندوستان کے حکمران تھے اب وہ ہندو افسروں کے قلم کے لئے سیاہی بھرنا یا ان کا سامان اٹھانے والے بن کے رہ گئے تھے۔ وہ نئے تعلیمی نظام کے ڈھانچے میں ڈھلنے کے لئے کسی طرح تیار ہی نہیں تھے۔ یہ کسی بھی قوم کے لئے بڑے شرم کی بات ہوتی ہے کہ وہ جو کبھی حکمران تھے اب نہ صرف اپنا مقام کھو دیں بلکہ یہ کہ ان کو احساس زیاں بھی نہ ہو۔ زندہ قومیں تو وہ ہوتی ہیں جو تمام تر مشکلات کے باوجود خود کو دوبارہ ابھار لیں۔ جو مصیبتوں کو ایک چیلنج سمجھیں اور ان کا بھر پور طریقے سے مقابلہ کریں اور دنیا کی قوموں کی صف میں اپنے لئے عزت ووقاردوبارہ بنا لیں۔ ۵

سر سید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے انہیں انگریزی علوم کی ترغیب دلائی جس کی وجہ سے اُن کی شدید مخالفت کی گئی۔ اگرچہ مسلمان علماء نے انگریزی اور جدید علوم کی مخالفت کبھی نہیں کی، بلکہ شاہ عبدالعزیزؒ جو کہ اُس دور کے مشہور عالم تھے، اُن سے جب انگریزی تعلیم کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا 'جاؤ'۔ اور انگریزی کالجوں میں پڑھو اور انگریزی زبان سیکھو، شرعاً ہر طرح جائز ہے۔'' ٦

تین وجوہات کی بنا پر مسلمان انگریزی تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے۔

۱- وہ اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھتے تھے۔

۲- یہ کہ انگریزی تعلیم کو ان پر زبردستی لاگو کیا گیا ہے۔

۳- اور انہوں نے انگریزی تعلیم کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ۷

سر سید نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ جدید علوم سے آراستہ ہوں۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے ابتدأء ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ کھولا۔ ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں قائم کی۔ جس کا مقصد انگریزی علوم کے تراجم اور اُنہیں

ہندوستان میں رواج دینا تھا۔

علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ

علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ یہ اخبار ۱۸۶۲ء میں علی گڑھ سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری ہوا۔ یہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ سر سید کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان جب تک جدید علوم نہیں سیکھیں گے اس وقت تک ان کی حالت نہیں بدل سکتی اور جدید علوم سیکھنے کے لئے حکمران کی زبان سیکھنا اور ان سے مصالحت کرنا ضروری ہے، چنانچہ وہ ایک طرف تو مسلمانوں میں بالخصوص اور ہندوستانیوں میں بالعموم یہ احساس پیدا کرنا چاہتے تھے کہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اور انہیں پورا کرنے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں۔ دوسری طرف وہ انگریزوں کو ہندوستانیوں خصوصا مسلمانوں کے مسائل اور احساسات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی میگزین کو اس مقصد کے لئے وقف رکھا۔۸

اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں غازی پور ہی میں ایک دوسرا سکول کھولا جس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ سر سید کا تبادلہ جب علی گڑھ ہوا تو اس نے سوسائٹی کو بھی وہاں منتقل کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اخبار بھی جاری کیا جس کا نام *علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ* تھا۔ اس کا ایک کالم انگریزی اور ایک اُردو میں ہوتا تھا۔ سو سائٹی نے کئی مفید کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائیں۔ جب تک سر سید علی گڑھ میں رہے سو سائٹی اور اخبار کا انتظام اُن کے ہاتھ میں رہا۔ لیکن جب اُن کا تبادلہ ۱۸۶۷ء میں بنارس ہوا تو راجہ جے کشن داس نے تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس دوران بھی سر سید اپنے مضامین بھیجتے رہے اور نگرانی بھی کرتے رہے۔ ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے اور وہاں سے بھی اپنے حالات اخبار کو بھیجتے رہے۔

۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپسی پر سر سید نے "کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کیلئے ایک کالج کھولا جائے۔ چنانچہ " محمڈن کالج فنڈ" قائم کیا گیا۔ فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے کالج کے لئے مکمل سکیم پیش کی۔ کمیٹی نے اسے منظور کیا اورایم اے او ہائی سکول علی گڑھ کے مقام پر قائم کیا گیا۔ سر سید اُس وقت بنارس میں تھے، لہٰذا سکول کا انتظام مولوی سمیع اللہ خان سیکرٹری علی گڑھ سب کمیٹی کو کرنا پڑا۔

مسلمانوں کے لئے سر سید کی تعلیمی خدمات علی گڑھ یونیورسٹی کی صورت میں آج تک موجود ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے علی گڑھ کا ذکر اپنی کتاب میں ''سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ (علی گڑھ تحریک)'' کے عنوان کے تحت کیا ہے۔علی گڑھ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''علی گڑھ تحریک کو بظاہر صرف سیاسی اور محض تعلیمی تحریک خیال کیا جاتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ہے۔ یہ ایک لحاظ سے علمی اور ادبی تحریک بھی ہے ۔علمی اس معنی میں کہ اس تحریک کے زیر اثر فکر و نظر میں اہم انقلاب نمودار ہوا اور مذاق تصنیف میں گہری تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ملک میں مغرب سے استفادہ کرنے کیلئے جو میلان پیدا ہوا اسکے ماتحت جس طرح اندازِ نظر بدل گئے اسی طرح معانی اور موضوعات میں بھی تغیر پیدا ہوا۔'' ۹

علی گڑھ بظاہر ایک کالج نظر آتا تھا لیکن درحقیقت مسلمانوں کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی اصلاح کے لئے ایک تحریک تھی ۔ یہی جگہ دو قومی نظریہ کا گڑھ رہی۔علی گڑھ نے ایسے لوگ پیدا کئے جنہوں نے نہ صرف حکومت کے بڑے بڑے عہدے حاصل کئے بلکہ ایک سیاسی تحریک کے طور پر ایسے لوگ بھی پیدا کئے جنہوں نے دو قومی نظریے کی بنیاد پر ایک الگ سیاسی جماعت ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے نام سے قائم کی۔ جس کی چالیس (۴۰)سالہ جدوجہد کی بدولت تقسیم برصغیر ممکن ہوئی بلکہ انگریزوں کو بھی یہاں سے نکلنا پڑا۔

''اگر علی گڑھ مکتبہ فکر کی تعلیمات اور خدمات کا غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ کی نشاطِ ثانیہ میں جو کردار آکسفورڈ ، کیمبرج اور ایڈنبرا جیسی یونیورسٹیوں نے ادا کیا ہے وہی کردار علی گڑھ مکتبِ فکر نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے ادا کیا۔'' ۱۰

سرسید کی صدی ایک ہنگامہ خیز صدی تھی۔خصوصاًنصف اخیر کا حصہ ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو کہ انگریزوں کی ایک تجارتی کمپنی تھی کی آمد کے ساتھ ہی انڈیا میں روز بروز اِس کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا، جو بالآخر حکومت پر قبضے پر منتج ہوئی۔ ناکام جنگ آزادی کے ساتھ ہی مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کی دشمنی شروع ہوئی۔ ایک طرف انگریزوں نے مسلمانوں کو جنگ آزادی کا ذمہ دار ٹھہرایا اور دوسری طرف مسلمانوں کے معاشی،معاشرتی اور مذہبی معاملات پر حملے شروع کر دیئے۔

اس صورتحال میں مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت بچانے کیلئے مسلمانوں میں دو مکتب

ہائے فکر نے جنم لیا۔ ایک دیوبند اور دوسرا علی گڑھ۔ دونوں مکتب ہائے فکر نے نیک نیتی سے مسلمانوں کی حالت دُرست کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ دونوں کا طریقہ کار جُدا جُدا تھا۔ سیاسی لحاظ سے دیوبند مکتبِ فکر نے ابتداء میں جہاد کا راستہ اپنایا اور ہر محاذ پر انگریزوں کے ساتھ لڑنے کو ترجیح دی، جو جنگ آزادی پر منتج ہوئی۔ اس جنگ کی ناکامی کے بعد کچھ جہادی رہنما روپوش ہوئے۔ بعض دوسرے ممالک کی طرف چلے گئے، اور اکثر کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈیمان بھیجا گیا اور بعض کو انڈیا ہی کی جیلوں میں قید رکھا گیا۔ جنگ آزادی کے بعد ان مجاہد رہنماؤں نے اپنے حقوق کے حصول کیلئے آئینی راستہ اختیار کیا۔ اس ضمن میں وہ کانگرس کے ساتھ شریک ہوئے اور ہندومسلم اتحاد پر زور دیا کہ ان دونوں کے اتحاد سے انگریزوں کو انڈیا سے بساطِ حکومت لپیٹنے میں مدد ملے گی۔ اسی وجہ سے اکثر مسلمان رہنماؤں نے کانگرس میں شمولیت اختیار کی۔ بقول ڈاکٹر فوق کریمی ''کانگرس میں مسلمان باوجود سرسید کی مخالفت کے روزِ اول ہی سے شریک تھے، اور اس جماعت کی بمبئی ،مدراس اور بنگال کے مسلمانوں سے جو کچھ خدمت ہوسکی وہ کی۔ ۱۸۸۷ء میں جب کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہوا تو اس کی صدارت بدرالدین طیب جی نے کی۔'' ۱۱

سیاسی خدمات

دوسری طرف علی گڑھ مکتب فکر تھا، جس کا مرکز علی گڑھ کالج تھا، اور اس کے رہنما سرسید احمد خان تھے۔ اُن کا سیاسی نقطہ نظریہ تھا کہ ہندومسلم اتحاد کی بجائے انگریز مسلم اتحاد ہو اور وجہ یہ بتائی کہ انگریز باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں اور کسی بھی وقت اُنھوں نے انڈیا سے جانا ہے لہٰذا ان کی غلامی عارضی ہے اور اگر ہندو حکومت پر قابض ہو گئے تو ان کی غلامی مسلمانوں کیلئے دائمی ہو گی۔ کیونکہ وہ تعداد میں مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ہیں لہٰذا علی گڑھ مکتبِ فکر کی یہ کوشش رہی کہ انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کی مخاصمت کی بجائے مفاہمت ہو اور علی گڑھ کالج کے قیام کے مقاصد بھی یہی بتائے۔ اس بات کا اقرار سرسید نے مختلف مواقع پر کیا۔ مثلاً انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس چہارم سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''میرا سب سے بڑا مقصد کالج کے قائم کرنے کا یہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں دوستانہ راہ و رسم پیدا ہو اور آپس کا تعصب اور نفرت دور ہو۔'' ۱۲

سرسید کی سیاسی بصیرت کا اندازہ مندرجہ ذیل نکات سے لگایا جا سکتا ہے۔

الف۔ اسبابِ بغاوتِ ہند:

انگریزوں نے جنگِ آزادی کا ذمہ دار نہ صرف مسلمانوں کو ٹھہرایا بلکہ اُن کو انتقام کا نشانہ بھی بنایا۔ اس صورتحال میں مسلمانوں کی مدد سرسید کو اس طرح سوجھی کہ *اسبابِ بغاوتِ ہند* کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ اس رسالے میں انہوں نے جنگ آزادی کی وجوہات کے حوالے سے انگریز کی ناانصافیوں کا صریحاً ذکر کیا۔[۱۳] انگریزوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلمان ہی اس جنگ کے ذمہ دار نہیں اور اس رسالے کی کاپیاں اُن انگریزوں کو بھیجی جو پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ اس رسالے میں سرسید نے درجہ ذیل وجوہات بیان کی کہ

۱۔ ملکی انتظامیہ میں ہندوستانیوں کی عدم نمائندگی

۲۔ مذہبی معاملات میں حکومت کی مداخلت

۳۔ سپاہیوں میں بے چینی پیدا کرنے والے قوانین

۴۔ حکمرانوں اور رعایا کے درمیان معاشرتی علیحدگی

اس کے بعد سرسید نے ایک اور کتاب *لائل محمڈن آف انڈیا* (ہندوستان کا وفادار مسلمان) لکھی۔ آپ نے مسلمانوں اور انگریزوں کو ملانے کے لئے ایک پل کا کام کیا اور مسلمانوں اور انگریزوں کی مخاصمت کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ قرار دیا اور کہا کہ جب تک ان میں افہام وتفہیم اور دوستانہ تعلقات قائم نہ ہوں گے مسلمان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آپ انگریزوں کی غلامی کو عارضی اور ہندوؤں کی غلامی کو دائمی سمجھتے تھے، اس لیے مسلمانوں اور انگریزوں کو ملانے کے کئی اقدامات کیئے، جیسے انجیل پر تبصرہ، سائنٹیفیک سوسائٹی آف انڈیا کا قیام اور انگریزی ادب اور دیگر علمی کتب کا اُردو ترجمہ وغیرہ۔ آپ نے مسلمانوں کی اصلاح احوال کیلئے جو نعرہ لگایا وہ اگرچہ بظاہر صرف تعلیم تک محدود نظر آتا ہے مگر حقیقت میں یہ زندگی کے بہت سے پہلوؤں کے متعلق تھا۔ اس میں ایک بڑا عنصر سیاست بھی تھا۔ اور بقول ڈاکٹر عبداللہ سرسید کے افکار کے دو بڑے میدان تھے؛ مذہب اور سیاست۔[۱۴]

ب۔ مسلمان فی الحال سیاست سے دور رہیں:

دوسرے مخالفین کے علاوہ سرسید کے قریب ترین رفقاء بھی اُن سے ہر بات پر متفق نہ تھے بلکہ ہر ایک نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ سیاسی میدان میں سرسید نے پہلے تو اس بات پر

زور دیا کہ مسلمان بحیثیت قوم متحد ہوں اور جب تک وہ ایسا نہیں کرتے انھیں سیاست میں نہیں آنا چاہیے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب سر سید نے مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کو صرف تعلیم کے حصول سے ہی ممکن قرار دیا۔ پھر سیاست میں بھی سر سید نے ہمیشہ انڈین نیشنل کانگرس کے اصولوں سے کبھی اتفاق نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مخالفت کی اور ساتھ ہی مسلمانوں کو کانگرس میں شمولیت سے روکنے کی کوشش کی۔ اُس وقت چونکہ مسلمانوں کا کوئی منظم سیاسی ادارہ نہیں تھا لہٰذا علی گڑھ کے مختلف پروگراموں میں اور خصوصاً محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد اس کے پروگراموں میں علی گڑھ کے زعماء کو ایک پلیٹ فارم مہیا ہو گیا، جہاں پر مختلف امور خصوصاً سیاسی امور سے متعلق اظہار رائے کرتے۔ اسی کانفرنس کے مختلف پرگراموں میں ہی سر سید نے کانگرس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ ''مسلمانوں کی بہبود ہندوستان میں سلطنتِ برطانیہ کے دوام اور استحکام پر منحصر ہے۔ کانگرس میں چونکہ نیابتی حکومت اور امتحانات مقابلہ کے اجراء کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے لئے مضر ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس میں شرکت سے روکا جائے''۔ ۱۵

کانگرس کے ایک سرگرم رکن بدرالدین طیب جی کو ایک خط میں سر سید نے کانگرس کے متعلق لکھا:

> ''میں نہیں سمجھ سکا کہ نیشنل کانگرس کے الفاظ سے کیا مراد ہے۔ کیا ہندوستان میں مختلف ذاتوں اور مذہبوں کے پیرو ایک قوم ہیں ؟ اور کیا یہ سب لوگ ایک قوم بن سکتے ہیں۔ اور کیا ان کے مقاصد اور مطالبات ایک ہو سکتے ہیں؟ میرے خیال میں یہ ناممکن ہے۔ تو پھر نیشنل کانگرس بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی، نہ یہ نیشنل کانگرس لوگوں کیلئے یکساں مفید ہو سکتی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کانگرس جس کو غلط طور پر نیشنل کہا جاتا ہے کے کارنامے سارے ہندوستان کے لیے مفید ہیں۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے کارنامے صرف مسلمانوں ہی کیلئے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے لیے مضر رساں ہیں۔ میں ہر اس کانگرس کے خلاف ہوں جو ہندوستانیوں کو ایک قوم تصور کرتی ہو۔ چاہے وہ کوئی شکل اور صورت اختیار کرے۔''۱۶

ج۔ دو قومی نظریہ:

سر سید کی سیاست کا مرکز دو قومی نظریہ تھا جس کی ابتدا بنارس میں ہوئی تھی۔ جہاں انہوں نے ہندی اُردو جھگڑے کو خود دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ مسلمان اور ہندو چاہے جتنے بھی قریب ہوں پھر بھی ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور یہ دونوں کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ دونوں قوموں کے اتحاد کے خواہاں تھے۔ ابھی تک سر سید کے نظریہ تعلیم میں مسلمان اور ہندوؤں کیلئے کوئی

تخصیص نہ تھی، مگر بنارس میں قیام کے دوران ہندی اُردو جھگڑے نے ان کا نظریہ ہی بدل دیا اور یہاں سے ہی اُنہوں نے اپنا مشہور دو قومی نظریہ پیش کیا۔

ہندوؤں نے انگریز حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ سرکاری دفاتر میں اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور اس زبان کے لئے دیوناگری رسم الخط کو اپنایا جائے۔ اس مطالبے نے جلد ہی ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ ہندو رہنما گورنر سے ملے اور اس پر دباؤ ڈالنے لگے۔ ہندوؤں کی طرف سے اردو کے خلاف یہ تحریک علمی اور ادبی کی بجائے سیاسی تحریک تھی اور اس کا مقصد ہندوستان سے مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ تہذیبی ورثے کو یکسر ختم کرنا تھا۔۱۷

یہ پہلا موقع تھا جب سرسید نے محسوس کیا کہ اگر ہندو اور مسلمان ایک قومی زبان پر متفق نہیں ہو سکتے تو ایک متحدہ قوم کی شکل میں آگے بڑھنا ان کے لئے ناممکن ہے اور کوئی شخص بیک وقت دونوں کی نمائندگی یا دونوں کے لئے کام نہیں کر سکتا۔۱۸

معاشرتی خدمات:

مغربی معاشرے کے مشاہدات اور مطالعہ نے سرسید احمد خان کے نظریات کو نئی جلا بخشی۔ آپ نے نہ صرف آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز پر ایک جدید تعلیمی درسگاہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا بلکہ *تہذیب الاخلاق* کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ *تہذیب الاخلاق* کا بنیادی مقصد مسلمانانِ ہند کی اصلاح اور ان میں انتہا پسندانہ رجحانات کی حوصلہ شکنی کرنا تھا۔ سرسید احمد خان اس رسالے کے ذریعے وہ کام سرانجام دینا چاہتے تھے جو کام ایڈیسن نے ٹیٹلر اور سٹیلے نے سپیکٹیٹر کے ذریعے انجام دیا تھا۔ اُنھوں نے معاشرتی اصلاح کے لیے اِسے ایک وسیع پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا۔ اس رسالے میں خبروں کے بجائے مذہبی اور معاشرتی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کے ذریعے سرسید اور اُن کے رفقاء نے ان باتوں کی تشہیر کی۔

۱- مذہبِ اسلام میں عقلی طرزِ فکر

۲- بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ اسلامی رسم و رواج میں مناسب تبدیلی

۳- اسلامی تاریخ و ادب کی ترویج

۴- زندگی کے بارے میں ایک نیا طرزِ فکر جو اپنی بنیاد کے لحاظ سے تو اسلامی تھا لیکن جدید

ضروریات سے ہم آہنگ بھی تھا۔

۵- عیسائیوں اور ان کی طرز زندگی کی بہتر تفہیم

رسالہ *تہذیب الاخلاق* کی پہلے دن سے مخالفت ہوئی اور اس کی کئی وجوہات تھیں۔ خصوصا مذہبی علماء نے اس پر کڑی تنقید کی اور اس کے جواب میں کئی رسالے شائع کئے گئے۔ لیکن اس کے باوجود اس رسالے کے حمایتی لوگوں کی کمی نہ تھی۔ سرسید نے ۱۸۷۶ء میں ''تفسیر القرآن'' لکھنے کی مصروفیات کی وجہ سے اس رسالے کو بند کیا۔ تاہم چھ سالوں کے دوران اس رسالے میں ۲۲۶ مضامین شائع ہوئے جن میں سے ۱۱۲ مضامین خود سرسید کے لکھے ہوئے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں ڈپٹی نذیر احمد نے سرسید کو *تہذیب الاخلاق* دوبارہ شائع کرنے کے لیے راضی کیا، اور دو سال اور پانچ مہینے تک یہ رسالہ جاری رہنے کے بعد پھر بند ہوا۔ لیکن ایک بڑی تبدیلی اس رسالے میں یہ آئی کہ معاشرتی اصلاح کے مضامین کی بجائے اس دفعہ اس میں مذہبی تنازعات اور اختلافات پر مضامین شائع ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں یہ رسالہ ایک مرتبہ پھر شائع ہو کر تین سال تک جاری رہا۔[۱۹]

سرسید کی تحریریں:

سرسید نے تصنیف وتالیف کے ذریعے بھی اپنے قوم کو جگانے کی کوششیں کی۔ اس سلسلے میں آپ کی تصانیف میں *جام جم، سرکشی بجنور، جلاء القلوب، آثار الصنادید، تحفہ اثنا عشریہ، تصحیح آئین اکبری، تاریخ فیروز شاہی، تبیین الکلام، تفسیر القرآن* اور *خطبات احمدیہ* شامل ہیں۔[۲۰]

خلاصۂ کلام

سرسید احمد خان ایک قد آور علمی شخصیت تھے۔ وہ اپنے عہد کے جملہ علوم سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کی علمی، فلسفیانہ، سائنسی، سیاسی، سماجی، اخلاقی، ادبی اور مذہبی تحریریں ان کی عظمت کی حقیقی گواہ ہیں۔ وہ سیاست دان بھی تھے، مفکر بھی، رہبرِ قوم بھی تھے اور مصلح بھی، علمی اور ادبی میدانوں میں بھی انھوں نے اپنی عظمت کا لوہا منوایا ہے۔[۲۱]

تاریخ کے اوراق اٹھا کر دیکھیں تو ہمیں ایسے بہت سے روشن چراغ نظر آتے ہیں جو مسلمانان ہند کے لئے راہیں استوار کرنے میں لگے رہے، اور بہترین مستقبل کے لئے انہیں اندھیروں اور گمراہی کی دلدل سے بچاتے رہے۔ ان کو دین اور دنیا میں عملِ پیہم کا درس دیتے رہے۔ وقت کے ان

اساتذہ میں سر سید احمد خان بانی علی گڑھ تحریک کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔

پاکستانی قوم ان کی خدمات کو جتنا بھی سراہے کم ہے۔ مسلمانان ہند کے لئے جدید علوم کا در سرسید نے کھولا۔ گو کچھ انگریزوں نے ان کی پشت پناہی کی مگر یہ بھی درست ہے کہ حمایت بھی انہیں لوگوں کی کی جاتی ہے جو اس طرف راغب ہوں۔ کسی بھی ادارے اور نظام کو چلانے کے لئے حکومت وقت کی اشیر باد لینا ضروری بھی ہوتا ہے، ورنہ حکومت اس کو پابندیوں میں جکڑ کر وقت سے پہلے اس کا گلا گھونٹ سکتی ہے۔ کچھ لوگوں کا سرسید پر الزام لگانا کہ وہ انگریزوں کے پٹھو تھے، ان کو یہ باور کرانا ہے کہ علم ودانائی کسی ایک قوم یا شخص کی میراث نہیں ہے، یہ ہر ذی شعور کا سانجھا حق ہے۔ اس لئے علم جو انسان کی بہتری اور بھلائی میں مددگار ثابت ہو اس کو بلا تکلف اپنا لینا چاہئے اور بلا ثبوت کسی پر الزام نہیں لگانا چاہئے۔

سرسید نے اس حقیقت کو بھانپتے ہوئے بہت سی سائنسی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ آج بھی اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان کے مشن کو ملک کے طول وعرض میں پھیلایا جائے۔ تعلیم کے دروازے ہر شہری کے لئے کھولے جائیں۔ تعلیمی نظام کی جانچ پڑتال کا ادارہ قائم کیا جائے، جو ہر نئی ایجاد اور تبدیلیاں جو علم اور آگاہی کے میدان میں رونما ہو رہی ہیں اس سے قوم کو آگاہ رکھیں۔

محلے اور گلیوں میں سنوکر کلب کی بجائے لائبریری اور درس وتدریس کا سامان مہیا ہو۔ اس بات پر خصوصی توجہ دی جائے کہ جہاں کپڑوں، جوتوں اور کھانے پینے کی اشیاء کی بہتات ہے وہاں سرسید کتب خانے بھی ہوں۔ قوم کو شعوری طور پر میدان عمل میں آنا ہوگا اور ایسے عناصر جو علم کے دشمن ہیں ان کو بھی حلقہ بگوش علم کرنا ہوگا۔ کسی کو برا کہنا تو آسان ہے اسے راستی کی طرف مائل کرنا مشکل عمل ہے، ناممکن نہیں۔ سرسید ہم سب کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ اپنے علم کی آبیاری اور تنوع کے لئے ضروری ہے کہ قوم سر سید احمد خان کے افکار کی روشنی میں اپنی ترجیحات میں تعلیم کو اولیت دے۔ تبھی قوم کی تقدیر بدلے گی۔

بقول الطاف حسین حالی ''سرسید کی روح میں قوم کو ایک جن مل گیا تھا جو اس کے لئے چشم زدن میں ہر وہ کام کر دیتا تھا جو برسوں سے ثروت وحکومت کے سہارے سے بھی نہیں ہو سکا تھا۔ کہیں غیروں کے حملوں کی روک تھام کی جا رہی تھی تو کہیں اپنوں کے ذہنوں سے اوہام کے جالے

صاف کئے جا رہے تھے۔ کہیں گرمیوں کی چل چلاتی دھوپ میں معماروں اور باغبانوں کی نگہبانی کی جارہی ہے تو کہیں نئے تصورات کی تحصیل اور اپنے اعتقادات کے تحفظ کے لئے سات سمندروں کے سفر کئے جا رہے ہیں۔ کہیں ملکی مجالس قانون ساز میں قومی مفاد کے حصول کے لئے تگ ودو کی جا رہی ہے تو کہیں تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ *خطباتِ احمدیہ*، *تہذیب الاخلاق* اور *تفسیر القرآن* کے ذریعے اذہان کی روشنی اور اخلاق کی بلندی کا سامان فراہم ہو رہا ہے۔[۲۲]

حوالہ جات

۱- جانباز مرزا، *انگریز کے باغی مسلمان*، مکتبہ تبصرہ لالہ زار کالونی کشمیر روڈ نیو شادباغ، لاہور، ۱۹۹۰۔
۲- کے کے عزیز، *دی میکنگ آف پاکستان*، اے سٹڈی ان نیشنلزم، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص۱۸۔
۳- مظہر انصاری دہلوی *سرسید احمد خان*، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص۲۵۔
۴- محمد علی چراغ، *اکابرین تحریک پاکستان*، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۱۷۲۔
۵- محمد صادق، *دی فاونڈر آف علی گڑھ، دی سٹوری آف سر سید احمد خان*، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص۱۸۔
۶- سر سید احمد خان، رسالہء اسبابِ بغاوتِ ہند۔
۷- اشتیاق حسین قریشی، *دی سٹرگل فار پاکستان*، یونیورسٹی آف کراچی، ۱۹۹۷ء، ص۱۷۔
۸- اسد سلیم شیخ، *انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان*، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۱۷۔
۹- ڈاکٹر سید عبداللہ، *سرسید کے نامور رفقاء*، ص۔ ۵۶۔
۱۰- ڈاکٹر نوشاد، مطالعہ پاکستان برائے بی اے/بی ایس سی، ص۔ ۲۸۔
۱۱- ڈاکٹر فوق کریمی، *سرسید کے سیاسی افکار*، ص۵۳۔
۱۲- مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز، مرتبہ: محمد امام الدین گجراتی، ص۴۳۰۔
۱۳- اسد سلیم شیخ، *انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان*، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۵۷۰۔
۱۴- ڈاکٹر سید عبداللہ *سرسید کے نامور رفقاء*، ص۔ ۸۶۔
۱۵- ڈاکٹر مبارک علی، *تاریخ کیا کہتی ہے*، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۳۴۔
۱۶- ڈاکٹر معین الحق، *سرکشی ضلع بجنور*، ص۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔
۱۷- پروفیسر ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری، *پاکستان: ایک عمومی مطالعہ*، ادارہ تصنیف و تالیف، وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص۱۱۳۔
۱۸- گل شہزاد سرور، *مطالعہ پاکستان*، رہبر پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص۸۶۔ ۔
۱۹- احمد سعید، *ٹریک ٹو پاکستان*، شاہد بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۲۶۔ ۔
۲۰- مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، (مرتبہ) مقالات سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص۲۔
۲۱- طاہر نسیم، *سرسید اور اردو صحافت*، مکتبہ عالیہ، ایبک روڈ، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص۱۳۔
۲۲- مولانا الطاف حسین حالی، *حیاتِ جاوید*، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۴۲۔